رسائل و مسائل

ڈارون کا نظریۂ ارتقاء

"ڈارون کا نظریۂ ارتقاء موجودہ زمانہ کے علمی مسلمات میں سے ہے، مگر قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے بار بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ دونوں کے نقطۂ نظر میں قطعی تضاد ہے۔ سب سے زیادہ صریح بات جو یک نظر محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کا انسان اول روز سے انسان ہی تھا جسے ایک خاص تاریخ کو یکایک ایک تخلیقی عمل سے پیدا کر دیا گیا، پھر اس سے انسانی نسل چلی لیکن ہم کو جو طبعی علوم پڑھائے جاتے ہیں وہ شہادت دیتے ہیں کہ انسان حیوانات میں سے بتدریج ترقی کرتا ہوا آیا ہے اور اس ارتقائی تسلسل میں کسی نقطہ پر انگلی رکھ کر نہیں کہا جا سکتا کہ ایک خاص تاریخ کو اس مرحلہ پر حیوانیت ختم ہوئی اور اس انسانیت کی ابتدا ہوئی جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ فَاِذَا نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سَاجِدِیْنَ۔ یہ قرآن اور نظریۂ ارتقاء کے اختلاف کی صرف ایک صریح مثال ہے، ورنہ تخلیق کے مسئلے میں بکثرت تفصیلات ایسی ہیں جہاں ان دونوں کے بیانات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھ کر موجودہ سائنس کا ایک طالب علم اپنے ایمان کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ کیا آپ اس مشکل کا کوئی حل بتا سکتے ہیں؟"

آپ نے جو سوال کیا ہے، خط و کتابت اس کے جواب کی کہاں متحمل ہو سکتی ہے۔ ایک نظریہ جو بڑے دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور موجودہ دور کے تمام بڑے بڑے علوم میں سرایت کر چکا ہے، اس کا تنقیدی مطالعہ اور قرآن کے بیانات سے اس کا تقابل ایک مستقل تحقیقی بحث چاہتا ہے جس کے لیے ایک مضمون میں بھی گنجائش نہیں نکل سکتی کجا کہ ایک مختصر خط میں۔ تاہم آپ کے اطمینان کے لیے چند اشارات کیے دیتا ہوں۔

پہلی بات یہ سمجھ لیجیے کہ ڈارون کا نظریہ جس طرح ابتدا میں صرف ایک نظریہ تھا اسی طرح آج تک نظریہ (Theory) ہی ہے، واقعہ (Fact) ابھی تک ثابت نہیں ہو سکا ہے۔ نظریہ اور واقعہ کا فرق آپ جیسے تعلیم یافتہ آدمی سے پوشیدہ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آدمی کے لیے اپنے ایمان پر نظر ثانی کرنے کا سوال صرف وہیں پیدا ہوتا ہے جہاں وہ چیز جس پر وہ ایمان رکھتا ہے کسی ایسی چیز سے ٹکرائے جو ثابت شدہ واقعہ ہو۔ قیاسات و نظریات کی ٹکر بھی جو ایمان نہ سہ سکے وہ کسی کام کا ایمان نہیں، خصوصاً جبکہ ان "علمی" قیاسات کی ساری تاریخ شاہد ہے کہ یہ بیچارے خود ایک صدی کے علمی تغیرات کی ٹکر بھی مشکل ہی سہ سکے ہیں۔

علم الحیات (Biology) کے جس مشکل ترین مسئلہ میں سائنس کے علماء الجھ رہے ہیں وہ دراصل یہ سوال ہے کہ زندگی کا مبدأ کیا ہے۔ قرآن اس کا جواب دیتا ہے کہ زندگی کا مبدأ خدا کا حکم (امر رب) ہے۔ وہ صرف خدا کا حکم ہی ہے جو بے جان مادے میں آثار حیات پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن موجودہ سائنس جن لوگوں کے ہاتھوں نشو و نما پا رہا ہے وہ اس کارخانۂ ہستی میں کسی فوق الفطرت ذات (Super natural) کی کارفرمائی و کاریگری ماننے اور محسوس کرنے سے ہر ممکن طور پر پہلو بچانا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ اسی کارگاہِ فطرت میں انھیں اس کی کارفرما طاقت کا بھی کہیں سراغ مل جائے۔ یہی بنیادی غلطی ان کے لیے وہ مشکل سوالات پیدا کرتی ہے جنھیں حل کرنے کے لیے وہ قیاس آرائیاں کرتے ہیں اور پھر اسی قیاس آرائی کا سلسلہ اشیائے کائنات کے تنوع اور ان کے تفاصیل کی توجیہ تک دراز ہوتا ہے۔ ان میں سے جو لوگ فی الواقع علمی ذوق رکھنے والے ہیں وہ تو قیاس کو قیاس ہی کی حد تک رکھتے ہیں، لیکن جو کم تر درجہ کے نوآموز ہیں (جن کو میں "علمی کم ظرف" اور دنیائے علم کا "نو دولتا" سمجھتا ہوں) ان کا حال یہ ہے کہ قیاسات و نظریات کو اس شان سے بیان کرتے ہیں گویا وہ حقائق ہیں جو علمی طور پر ثابت ہو چکے ہیں۔ اسی سے سائنس کے مبتدیوں کو غلط فہمیاں لاحق ہوتی ہیں۔

ڈارون نے جب تحقیق و تجسس کا آغاز کیا اس وقت اگر وہ قرآن کے دیے ہوئے نقطۂ آغاز (Starting point) سے چلتا تو اس نتیجہ پر پہنچتا کہ زندگی کی شکلوں میں یہ تنوع اور تفاصیل جو ایک بے نظیر ترتیب کے ساتھ واحد الخلیہ

بھنگے (Unicellular molecule) سے لے کر انسان تک نظر آ رہا ہے، یہ ایک حکیم کے منصوبے (Design) کا نتیجہ ہے جو مختلف انواع کی زندگی کے لیے مناسب ماحول اور سازگار حالات فراہم کرنے کے بعد انھیں ان کی مخصوص نوعی خصوصیات کے ساتھ بتدریج وجود میں لاتا چلا گیا ہے اور جن انواع کی ضرورت اس کے نقشے میں باقی نہیں رہی ہے انھیں مٹاتا بھی رہا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، یہ لوگ منصوبہ ساز (Designer) کو ماننے سے جی چراتے ہیں اور اس کی کارگاہ میں اس کی کارفرمائی کے نشانات دیکھنا نہیں چاہتے اس لیے جو شواہد ان کے مشاہدے میں آتے ہیں ان کی توجیہ یہ کسی ایسے طریقے سے کرنا چاہتے ہیں جس سے یہ کارخانہ خودبخود چلتا اور ترقی کرتا ہوا سمجھا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈارون نے تنوع اور تفاضل کی توجیہ ارتقا کے اُس نظریے سے کی جو اس کے نام سے مشہور ہے، اور یہی وجہ ہے کہ یورپ جو اس وقت تک اپنے الحاد کو پاؤں کے بغیر چلا رہا تھا، لپک کر یہ لکڑی کے پاؤں ہاتھوں ہاتھ لیے اور نہ صرف اپنے سائنس کے تمام شعبوں میں، بلکہ اپنے فلسفہ اخلاق اور اپنے علوم عمران تک میں ان کو نیچے سے فٹ کر لیا۔ حالانکہ علمی و عقلی حیثیت سے اس کی توجیہ میں اتنے جھول ہیں کہ مشکل ہی سے کوئی صاف دماغ کا آدمی اس کو منظر کی ممکن توجیہات میں ایک قابل لحاظ توجیہ قرار دے سکتا ہے۔

پیچیدہ اور گہری علمی تنقید سے بچتے ہوئے میں آپ کو ایک مثال سے ڈاروینی نظریہ ارتقا کا اصلی و بنیادی ضعف سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ فرض کیجیے کہ مریخ سے سائنس کا ایک پروفیسر اپنے کچھ شاگردوں کے ساتھ علمی تحقیقات کے لیے زمین پر آتا ہے اور ان لوگوں کی بینائی میں کوئی ایسی کمزوری ہے جس کی وجہ سے وہ یہاں انسان کو نہیں دیکھ سکتے البتہ انسان کی مصنوعات اور اس کے تمدن کے آلات و وسائل کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ محقق پروفیسر یہاں انسان کی جو صنعتیں دیکھتا ہے ان میں اسے شکلوں اور نوعیتوں کا فرق بھی نظر آتا ہے، ان میں سے بعض کو وہ بعض سے بہتر بھی پاتا ہے، دوران تحقیق میں اس کو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض چیزیں پہلے رائج نہ تھیں، بعد میں رائج ہوئیں، بعض قدیم سے رائج رہی ہیں اور اب تک رائج چلی آ رہی ہیں، اور بعض پہلے رائج تھیں مگر اب مفقود ہیں۔ کچھ زمانہ تک وہ اس بکھرے ہوئے منظر کی اشیاء کو اپنے ذہن میں مرتب کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ مختلف قسم کی اشیاء کو انواع اور اصناف میں تقسیم کرکے

ان کے درجات قائم کر لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ تحقیق کا قدم آگے بڑھاتا ہے اور یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آخر یہ تنوع اور تفاضل اشیاء میں کیسے، اور ان کے تنوع اور تفاضل میں اور بعض کے باقی اور بعض کے معدوم ہو جانے میں کیا اسباب اور کیا قوانین کار فرما ہیں۔ اس سوال کا ایک جواب اگرچہ یہ بھی ممکن تھا کہ یہاں غلباً ایسی اور ایسی صفات کی کوئی ہستی موجود ہے جو ان چیزوں کو اپنی مختلف مصلحتوں کے لحاظ سے بناتی ہے، جن چیزوں کی ضرورت باقی ہے انھیں بنائے چلی جاتی ہے، جن کی ضرورت باقی نہیں رہی انھیں بنانا چھوڑ چکی ہے، اور جن کی ضرورت اب کسی دوسری شکل کی چیز سے بہتر طور پر پوری ہونے لگی ہے انھیں بنانا چھوڑتی جا رہی ہے۔ لیکن کسی وجہ سے یہ تاریخی محقق کسی ایسی ہستی کو فرض کرنے سے بچنا چاہتا ہے اس لیے وہ قیاس کا رُخ دوسری طرف پھیر کر اپنے نظر کی توجیہ اس طرح شروع کر دیتا ہے کہ ان تمام مصنوعات کی ابتدا غالباً صنعت کے ایک ہی ابتدائی بیج سے ہوئی تھی، پھر اس میں ارتقاء شروع ہوا اور ماحول کے فلاں فلاں اسباب سے ان اشیاء کی مختلف انواع وجود میں آئیں، پھر ان انواع نے ایک دوسرے کے خلاف کشمکش شروع کی اور ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنے ماحول سے اپنے آپ کو موافق کرنے اور ماحولی طاقتوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، اس کشمکش میں جو مصنوعات ناکام رہ گئیں وہ مٹ گئیں اور جو کامیاب ہوئیں انھیں ماحول نے بقاء کے لیے چن لیا۔ یہی کشمکش ان مصنوعات کی شکلوں اور صفتوں کے ارتقاء کی موجب ہوئی اور بقاء کی جدوجہد ہی میں ایک نوع کی چیزیں ترقی کرتے کرتے دوسری نوع کی مصنوعات میں تبدیل ہوتی چلی گئیں، مثلاً چھکڑے کی نوع مدتوں تک زور لگاتی رہی یہاں تک کہ اس کے بعض قابل تر افراد کی ترکیب میں تغیرات رونما ہوتے چلے گئے اور بالآخر وہ گھبی میں تبدیل ہو گئے۔ پھر گھبی کی نوع نے زور لگانا شروع کیا حتیٰ کہ اس کے بعض قابل افراد کی ترکیب میں پھر تغیر آنے لگا اور بالآخر وہ موٹر میں تبدیل ہو گئے۔ پھر بعض موٹروں نے اونچے اونچے درختوں اور مکانوں اور عمارتوں کو دیکھ کر ان کے اوپر پہنچنا چاہا اور اس کوشش میں اچکنا شروع کیا یہاں تک کہ اچکتے اچکتے ان کے پر نکل آئے اور بالآخر وہ ہوائی جہاز میں تبدیل ہو گئیں۔ اس محقق جلیل کے ساتھ مریخ کے سائنس کالج سے جو طالب علم آئے تھے وہ عرض کرتے ہیں کہ قبلہ، چھکڑے سے گھبی اور گھبی سے موٹر اور موٹر سے ہوائی جہاز تک بتدریج جو ارتقاء ہوا ہو گا تو لازماً چھکڑے اور گھبی کے

درمیان، اور بگھی اور موٹر کے درمیان، اور موٹر اور ہوائی جہاز کے درمیان بکثرت ایسی کڑیاں پائی جانی چاہییں جو ان میں سے ہر دو نوعوں کے بیچ کا فاصلہ بھی طے کر رہی ہوں، اور اس فاصلہ میں ہر ہر قدم پر ان درمیانی کڑیوں کے مختلف افراد ایک قافلے کی طرح آگے پیچھے چلتے نظر آنے چاہییں۔ مثلاً بگھی اور موٹر کے درمیانی فاصلے میں بہت سی ایسی اقسام کی گاڑیاں ملنی چاہییں جو ابھی کچھ بگھی ہوں اور کچھ موٹر ہونے کے مختلف درجوں میں ہوں، اور اسی طرح موٹر اور ہوائی جہاز کے درمیان ایسی بہت سی اقسام کی سواریاں پائی جانی چاہییں جو ابھی پر نکال رہی ہوں۔ اس سوال کو سن کر پروفیسر صاحب کچھ دیر سوچتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ ہاں، یہ درمیانی کڑیاں ضرور پائی جاتی ہوں گی، بگھی سے "بگھ موٹرا" بنا ہوگا، پھر وہ "موٹر بگھے" میں تبدیل ہوا ہوگا، پھر اس نے "موٹر بگھ" کی شکل اختیار کی ہوگی، پھر وہ موٹر میں تبدیل ہو گیا جسے تم دیکھ ہی رہے ہو، پھر موٹرا اپنی ارتقائی جدوجہد سے "پنکھ موٹرا" بنی ہوگی، پھر وہ "موٹر پنکھ" میں تبدیل ہوئی ہوگی، پھر "موٹر پنکھا" پیدا ہوا ہوگا، پھر وہی تبدیل ہو کر یہ ہوائی جہاز بن گیا جو تمھارے سامنے موجود ہے۔ یہ بیچ کی کڑیاں جن کے نام میں نے لیے ہیں ضرور کہیں نہ کہیں پائی جاتی ہوں گی، جاؤ اور مٹی کے ڈھیروں میں انھیں تلاش کرو۔ استاد تو یہ کہکر خاموش ہو گیا، مگر شاگرد جو مرنج ہی سے انسان کے خلاف ایک تعصب دل میں لیے ہوئے آئے تھے، اس کی اس نادر تحقیق پر ایسا ایمان لائے کہ انھوں نے استاد کے کلام میں سے "غالباً" اور "ہوا ہوگا" کو بھی نکال دیا اور اب وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس کو "یقیناً" اور "ہے" کے ساتھ بیان کرنے لگے ہیں۔ ان کے علمی لکچروں میں "موٹر بگھا" اور "پنکھ موٹرا" وغیرہ خیالی موجودات کا ذکر اس طرح آتا ہے گویا کہ یہ چیزیں کہیں ان کے میوزیم میں موجود ہیں۔

ڈارون کے نظریہ اور ڈارونیت کے متبعین پر یہ تمثیل بالکل ٹھیک ٹھیک راست آتی ہے۔ اس نظریہ کے اصلی لٹریچر کو آپ دیکھیں گے تو آپکو معلوم ہوگا کہ اسکی ساری بنیاد "ہوگا" پر ہے، حالانکہ سائنس میں اصل قابل اعتبار چیز "ہے" ہے نہ کہ "ہوگا"۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر سائنس میں "ہوگا" کی بھی کوئی اہمیت رکھتا ہے تو ایک "ہوگا" اور دوسرے "ہوگا" میں فرق کیوں ہو، خصوصاً جبکہ ایک "ہوگا" دوسرے "ہوگا" سے کچھ زیادہ ہی لگتا ہوا ہو۔ جب آپ اس کے لیے تیار ہیں کہ شہوات کی توجیہ میں "ہوگا" کو بھی مان لیں تو ڈارون کے "ہوگا" سے میرا یہ "ہوگا" کچھ زیادہ

ہی لگتا ہوا ہے کہ زندگی کا آغاز اور زندہ اشیاء کا تنوع اور ان کا تفاضل سب کا سب ایک حکیم کے امر اور حکیمانہ تدبر سے ہے۔ میرا یہ "ہو گا" ڈارون کے "ہو گا" سے زیادہ بہتر طریقہ پر تمام شہوات کی توجیہ کرتا ہے، کسی سوال کو لاجواب نہیں چھوڑتا، اور سب سے بڑھ کر اس کے حق میں وجہ ترجیح یہ ہے کہ اُس طرف تو کوئی آدمی صداقت کے ساتھ "ہو گا" سے زیادہ کچھ کہنے کے قابل نہیں ہے مگر اس طرف کثرت صالح ترین انسان، جو کبھی جھوٹ بولتے نہیں پائے گئے، پورے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کر چکے ہیں کہ "ہے" اور ہم آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں کہ "ہے"۔ پھر کیا وجہ ہے کہ سائنس کے طالب علم ادھر آنے کے بجائے اُدھر جا رہے ہیں؟ کیا اس کی کوئی وجہ اُس خدا بیزاری (Theopholia) کے سوا ہے جو قرون متوسطہ سے سائنس کے طالب علموں کو میراث میں ملی ہے؟ اگر یہی بات ہے تو "جذبات" کا نام لوگوں نے "علم" کیوں رکھ چھوڑا ہے۔

علمی اور عقلی حیثیت سے اس نظریہ میں جو کمزوریاں ہیں ان سے قطع نظر کر کے اگر دیکھا جائے کہ فلسفے اور اخلاق اور علوم تمدن و اجتماع میں داخل ہو کر اس ظالم تخیل نے انسان کو برباد کرنے کے لیے کیسے شدید فتنے برپا کیے ہیں، تو شاید کسی صاحب بصیرت آدمی کو یہ ماننے میں ذرہ برابر تامل نہ ہو گا کہ موجودہ دور میں جن نظریات نے انسان کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کی ہے، یہ ڈارونیت ان سب کی سرتاج ہے۔ اگر انسان کی فلاح چاہنے والوں کے ہاتھ میں اقتدار ہو تو وہ اس نظریے کی تعلیم دینے والوں کے ساتھ اس سے زیادہ سخت برتاؤ کریں جو انارکی پھیلانے کے لیے بم سازی اور ڈاکہ زنی کی تعلیم و تبلیغ کرنے والوں سے کیا جاتا ہے۔

نواقض وضو

"اسلام نے جسم و لباس کی طہارت و نظافت کا جو لحاظ رکھا ہے اس کی قدر و قیمت سے عقل انسانی انکار نہیں کر سکتی۔ لیکن اس سلسلہ میں بعض جزئیات بالکل ناقابل فہم معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ریح کے نکلنے سے وضو کا ٹوٹ جانا، حالانکہ جسم کے ایک حصہ سے محض ایک ہوا کے نکل جانے میں بظاہر